دیدۂ نم

ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی

ہولڈنگ نمبر A-1، بی ایل نمبر 23، کیلا بگان، جگتدل، نارتھ 24 پرگنہ (مغربی بنگال)، موبائل: 9339327323

اس دن ساری رات فضیلت النساء کو افطار کے وقت بچوں کا شور.... ''لال بتّی جل گئی۔!!'' کی بازگشت سنائی دیتی رہی اور اس کے وجود پر ذِلّت کی گھنگھور گھٹا چھائی رہی۔!!

عصر کا سورج نیچے اُترتا جا رہا تھا۔ چند گھنٹوں میں ۲۷ واں رمضان المبارک الوداع کہنے والا تھا اور آنے والی رات شبِ قدر کی رات تھی۔ آنگن میں املتاس کے نیچے چارپائی پر بیٹھ کر وہ نیل گوں آسمان کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ گویا خدا سے پوچھ رہی ہو۔!!

''مالکِ کائنات میرا کیا قصور تھا کہ تو نے میرے اجداد کو محلوں کا مالک بنایا اور مجھے اِس گھر کی نوکرانی بنا دیا۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ جو میرے پُرکھوں پر حرام تھا وہ مجھ پر حلال ہو گیا۔!! آج دیکھ اِس سامنے والی بلڈنگ میں افطار کی دعوت ہے۔ انواع و اقسام کے دسترخوان چنے جائیں گے۔ میرا چولہا سرد پڑا ہے اور میرے معصوم بچے آج پانچ دنوں سے روزہ پر روزہ رکھے جا رہے ہیں۔!''

جب سورج ڈوبنے کے قریب پہنچا تو وہ مالکِ مکان کے تمام کام کاج نپٹا کر تھکی تھکی بوجھل قدموں سے گھر واپس آئی۔ بیٹے فیصل اور بیٹی حمیرا کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

''کہاں چلے گئے۔؟ اِدھر آؤ۔ چلو گھر میں چلو۔!!''

اور وہ مرغی کی طرح اپنے چوزوں کو سمیٹے ہوئے گھر میں چلی آئی، لیکن گھر میں آ کر وہ کرے تو کیا کرے پکانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا اور ستم یہ کہ آج کسی کے یہاں سے کوئی فیض بھی نہیں پہنچا تھا۔!! کسمپرسی کے ان دنوں میں اکثر رات کی درازی کو کاٹنے کے لیے فضیلت النساء جانماز کا سہارا لیتی اور دعا کے لیے ہاتھ ایسے اُٹھتے کہ سورج کے اُجالے اُفق پر پھیل گئے لیکن مقدّر کی گلیاں ویسے کے ویسے اندھیرے میں ڈوبی رہیں۔ خوابوں کے خیمے جلتے رہے! اِس دوران اس کو کبھی کبھی یاد آتی اُن دنوں کی بات جب اکلوتے بڑے بھائی دلاور مرزا کی بے وقت موت سے والد بالکل ٹوٹ گئے اور اس کی جدائی کے غم کو سہتے سہتے ایک دن وہ بھی دلاور مرزا کے پاس جا کر لیٹ گئے۔ ابھی ان کی برسی کی رسم پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ماں کی فاتحہ خوانی کا بھی اہتمام کرنا پڑا۔ اس وقت اس نے زندگی کے انیسویں پائیدان پر قدم رکھا تھا۔ ایک دن شام کے دُھندلکے اُفق میں ڈوب رہے تھے اور بنارسی دوپٹے کے گوٹے دار آنچل کو سنبھالے طوطا شاہ کی سن رسیدہ والدہ زیب النساء دروازے پر دستک دے کر اندر آنے کی اجازت مانگ رہی تھیں۔ موسم کی اِس تبدیلی پر کچھ حیرت ہوئی تھی۔ جلدی جلدی کلائی سے فیروز آبادی ریشمی چوڑی نکال کر سنگاردان پر رکھتے ہوئے اُنھیں اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ سامنے طاؤس نما بید کی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ میں نے اپنے اجداد کی مہمان نوازی کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے گلاس میں گلاب کے چند قطرے ڈال کر کنویں کا ٹھنڈا پانی پیش کرتے ہوئے پوچھا۔

''حضور آج شمس کی کرنیں اِس کنیز کی اندھیری کوٹھری تک کیسے آئیں؟'' اُنھوں نے خالی گلاس کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''فضیلت النساء یہ طلوع نہیں بلکہ غروب آفتاب کی کرنیں ہیں جنھوں نے ہمارے اجدادی اُفق کو ابھی بھی اپنی سرخی سے منوّر کر رکھا ہے۔ تم تو سب کچھ جانتی ہو کہ ہمارے اجداد کا مقدّر بامِ عروج پر پہنچ کر اب روبہ زوال ہے۔ اُس وقت میں نئی نویلی دلہن بن کر اِس محل میں اُتری تھی جب سرمئی اُجالے میں اِسی جمنا کے کنارے ہمارے پُرکھوں نے اپنے تاج کو فاتح کے قدموں میں رکھ دیے تو پھر سورج کا غروب ہونا لازمی تھا۔!! جس کے اثرات یہ ہوئے کہ پہلے پہل صدر دروازے پر ریشمی پردے کی جگہ ٹاٹ نے لی۔ پھر جازمین ہٹیں۔ جب دھیرے دھیرے تنور سرد ہونے لگے تب محل سے شہزادے اور شہزادیوں کے قدم باہر نکلنے لگے۔ جو بگھی پر چڑھتے تھے وہ بگھی چلانے لگے۔ جن کے پُرکھوں نے دوسروں کے فیصلے کئے اب اُن کے فیصلے کئے جانے لگے۔ روزانہ علی الصباح حمام خانے میں عرق گلاب سے غسل کرنے والی شہزادیوں نے کھلے عام سڑک کے کنارے نلکیوں پر غسل کیا۔ کتنوں کی نگاہیں حیا سے نیچے جھکیں تو بہتوں نے ٹکٹکی باندھے ان کے پُرشباب جسموں کو دیکھا۔ شان و شوکت اور عزّت کی بکھرتی دھجیوں کو دیکھ کر قلق سے بزرگوں کی روحیں بھی پرواز ہوئیں۔ اس میں تمہارے دادا اور میرا اکلوتا بھائی دلفگار مرزا بھی شامل تھا۔ بڑے بزرگوں کا

قول ہے کہ جب غربت کے سائے لہراتے ہیں تو ان کے دامن میں سیکڑوں گناہ بھی پنپنے لگتے ہیں۔ایسے ہی گناہ شہزادے اور شہزادیوں سے بھی سرزد ہونے لگے۔میری خوش دامن اکثر کہا کرتی تھیں ۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔اُسے صرف آسودگی چاہئے۔اس کے لیے نہ تو وہ اپنے مرتبے کا خیال رکھتی ہے نہ اِجدادی عظمت کی پاسداری۔!! شہزادوں نے تھوڑی بہت اجداد کی عظمت کا پاس رکھا لیکن عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں اس لئے زوال کے ان لمحوں میں محل کی پریوں جیسی شاہزادیاں جس کے ہتھے چڑھیں گڈّی کی طرح لوٹ لی گئیں! اب نوبت ہمارے بھی شہزادے اور شہزادیوں کی ناموس اور عصمت تک آ پہنچی ہے اور تمہارا شمار محل کی حسین ترین شہزادیوں میں ہوتا ہے۔شہر کی گلیوں میں سنپولے کنڈلی مارے بیٹھے رہتے ہیں۔کون کس کو کب ڈس لے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ہم سے تمہارا خونی رشتہ ضرور ہے،لیکن ایسا نہیں کہ شرعی اعتبار سے تم شاہ زیب مرزا کے نکاح میں نہ آ سکو۔خدانخواستہ اگر کچھ اونچ نیچ ہوگئی تو یہ شہر منافق ناک پر دم کردے گا اور یہ ذِلت محل کے باقی بچے بڑے بزرگ برداشت نہیں کر پائیں گے کہ وہ بھی اُسی بجھے چراغ سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کی لکیر کا ایک ناقابلِ گریز حصہ ہیں۔!!''

زیب النساء کی پیش کش سے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خزاں کے موسم میں بھی میرے اندر کی زرخیز مٹی پر اُگے شاخ گلاب کی مرجھائی سیکڑوں کلیاں یک بہ یک کِھل اُٹھی ہوں اور بادِ بہار کے جھونکے قدآدم کھڑکی سے اندر آنے لگے ہوں۔!بہت دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔! پھر میں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی۔جانماز بچھا کر بارگاہ خداوندی میں فیصلہ طلب کیا!ایک ندا آئی! میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے! جانماز پر بیٹھے بیٹھے مرحوم والدین کی روح سے باتیں کیں! آنکھیں بھیگ گئیں!!اللہ اکبر کہہ کر جانماز کو سمیٹ کر محرابی طاق پر رکھا۔مرادآبادی پاندان سے ایک عدد میٹھے پان کی گلوری پر چاندی کے ورق لگا کر اُس کمرے میں واپس آئی جہاں برّاق کی طرح سفید،اونچی پیشانی،ہونٹوں پر پان کی سرخی ،کانوں میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں اور پائینچے دار شلوار جمپر پہنے مصری تسبیح کے دانے سے کھیلتی ہوئی بید کی طاؤس نما کرسی پر زیب النساء ہمارے فیصلے کی منتظر تھیں۔رسمی طور پر خیر خیریت پوچھنے کے بعد شفاف نیل گوں آسمان سے ساون کی پھواروں کی طرح جھر جھر برستی چاندنی میں ان کو دروازے پر پان دے کر رخصت کرتے ہوئے بس اتنا ہی کہا۔

''اجداد کی ناموس کی پاسداری کے لیے یہ کنیز آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔!!'' پان کی گلوری کو منہ میں دباتے ہوئے انھوں نے کہا۔

''ابھی بھی ہمارے خون میں بڑے بزرگوں کا احترام باقی ہے۔!''

دس دنوں تک ماہ محرّم کی حالت میں رہنے کے بعد عاشورہ کے دن قاسم مہ پارے کی مہندی کی رسم پوری ہوگئی اور بی بی زینب کا ڈولا امام بارگاہ کے صدر دروازے سے رخصت کر کے زیب النساء کی خواہش کے مطابق مجھے شگن کی چوکی پر بیٹھنا پڑا۔پھر ایسا ہوا کہ شگن کے تیل سے دیے کی لو ذرا اونچی ہوگئی اور شاہ زیب مرزا کا دامن ایسے تھاما کہ اس کے قبرستان جانے کے بعد ہی ہاتھ سے چھُٹا۔ساٹھ سالہ اس سفر کے دوران چاندنی دھیرے دھیرے جھیل میں ڈوب گئی۔ستارے ایک ایک کر کے دم توڑ گئے۔ باغ کے پتے پتے نے شاخوں سے رشتے منقطع کر لیے۔ریشمی لباس رفتہ رفتہ بدن سے اُترنے لگے۔خوابوں کے خیمے کی سبھی طنابیں ایک ایک کر کے ٹوٹ گئیں۔کلائیوں سے سونے کے کنگن کی کھنک بھی روٹھ گئی۔نشیب وفراز اور مصیبت کی اِس گھڑی میں ایک شام جمنا کے کنارے دھیان سنگھ کی جلتی چِتا پر چندن کی شاخ رکھتے ہوئے زیب النساء پھوٹ پھوٹ کر یہ کہتے ہوئے رو پڑی تھیں کہ ہمارے محل کا آخری وفادار سپہ سالار بھی آج دغا دے گیا!اُس دن رات کو میں نے دیکھا محل کے تمام لوگ زیب النساء کے ساتھ محل کے آنگن میں اُداس اسی طرح بیٹھے رہے جیسے اچانک طوفان میں تناور درخت گرِ جانے کے بعد اُس کی شاخوں پر بسیرا کرنے والے پرندے ساری رات زمین پر سر جھکائے کاٹ دیتے ہیں!اس کے بعد اِس صدمے سے اِس قدر نڈھال ہوئیں کہ ایک دن سفید دوشالہ اوڑھے ڈولی پر سوار ہو کر زیب النساء بھی چلی گئیں۔اُن کی رخصتی کے بعد بہاروں کے پرندے نہ جانے کب ہجرت کر گئے، پتہ ہی نہیں چلا۔جب زیب النساء کی پازیب کے گھنگھروؤں کی آواز سے محل کا سائبان محروم ہوگیا تو شاہ زیب مرزا نے ایک ڈوبتی شام کو غمگین ہو کر کہا۔

''بیگم اب اِس کھنڈر نما محل کی خاموشیاں مجھے دن رات ڈستی رہتی ہیں۔!!''

اتنے میں طوفان کا شدید جھونکا مغرب سے آیا اور محل کے سائبان کا فانوس جھماکے کے ساتھ فرش پر گر کر چکنا چور ہوگیا۔شاہ زیب مرزا نے اپنے پُرکھوں کی وراثت کی بکھری کرچیوں کو دیکھ کر ڈبڈبائی آنکھوں سے اتنا ہی کہا۔

''آج طوفان کے تھپیڑوں سے میرے پُرکھوں کی آخری نشانی بھی ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔!''

جب تنگدستی کی گرفت بڑھی تو نوبت فاقہ کشی تک جا پہنچی۔پھر وقت کے ان تھپیڑوں نے شاہ زیب مرزا کو شاہ زیب مرزا سے طوطا شاہ بنا دیا۔ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔دھوپ اپنے شباب پر تھی۔طوطا شاہ خالی کشکول اور چہرے پر ملال لیے گھر میں داخل ہوا۔اُس نے خالی کشکول کو دیوار پر

ٹانگ کر وضو کے لیے پانی مانگا۔صحن میں مصلّے کو بچھایا۔عطر فروش کی دکان سے لائے عطر کو قمیص میں لگایا اور چار رکعت نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اوپر اُٹھائے۔اُس کی رقت آمیزی دیکھ کر ایسا لگا جیسے خالق کائنات آسمان توڑ کر اُس کے مصلّے پر اُتر آئے گا۔اُس کا نورانی چہرہ آنسوؤں سے تر ہوگیا۔اُس کی رقت آمیزی مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔تب میں نے اُٹھ کر گلاس میں پانی دیتے ہوئے کہا۔

''طوطا شاہ لو کبھی اِس گلاس میں تمہارے اجداد فتح و کامرانی کے بعد فخر کا جام پیا کرتے تھے۔آج تم صبر کا جام پی لو۔!!''

اس کے اندر کے اجدادی خون نے جوش مارا۔بدن پسینے پسینے ہوگیا۔چہرہ ایسے دمک اُٹھا جیسے اُس پر گاڑھے دودھ میں سیندور ملا کر مل دیا ہو۔چہرے کو اپنی آستین سے صاف کیا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے گلاس کو منہ سے لگایا۔پھر اُس دن کے بعد تا مرگ میں نے اُس کے چہرے پر ذرّہ برابر ملال کی پرچھائیوں کو لہراتے نہیں دیکھا،لیکن آنکھوں کی نمی ویسے ہی برقرار رہی جیسے اُس کے دل کے قریب کوئی دریا بہہ رہا ہو!ایسے میں بھی اُس نے اپنی خوددار طبیعت کی شاخوں کو بادِ مخالف میں خم ہونے نہیں دیا بلکہ اپنے پُرکھوں کے جاہ وجلال کے غازہ کو اپنے چہرے پر ملتا رہا کہ اتنے میں اُس کی نوسالہ بیٹی حمیرا نے اُس کے خیالوں کے تسلسل کو یہ کہتے ہوئے توڑ دیا۔

''امّی جان کب تک ہم لوگ روزہ پر روزہ رکھیں گے؟اب برداشت نہیں ہو رہا ہے۔کیا وقت کے دھارے یوں ہی چلتے رہیں گے،اس کو بدلا نہیں جاسکتا ہے امّی جان؟''فضیلت النساء نے جانماز کو فرش پر بچھاتے ہوئے کہا:

''بیٹی حوصلے بلند ہوں تو وقت کے دھارے کیا صدیوں کے رُخ کو بھی موڑا جاسکتا ہے۔!!''

''لیکن کیسے امّی جان۔؟''اُس نے کہا۔

''حوصلے اور صبر کے مستول کو نیچے مت جھکنے دو!''کیا تم کو معلوم ہے کہ تمہارے اجداد کون تھے؟

اُس نے حیرت سے ماں کا منہ دیکھا۔اُس کو ماں کی باتوں سے لگا جیسے وہ محل میں کھڑی ہے۔چاروں طرف گلاب اور مونگرے کی کھیتی لہلہاتی نظر آرہی ہے۔تا حدِ نگاہ سرسبز وادیاں،جھیل میں تیرتے راج ہنس اُس سے کہہ رہے ہوں۔شہزادی آیئے آج کی شام آپ کے نام کرتے ہیں۔آپ ہماری کرتب بازیوں سے محظوظ ہوتی جایئے۔!!جھیل کی نرم نرم لہروں پر وہ اپنے شکارے کو پتوار سے آگے کی طرف بڑھاتی جارہی ہے اور کوئل،پپیہے کی کوک سے پوری فضا گونج رہی ہے۔!!جب وہ اِس سحر سے باہر نکلی تو اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی ماں کہہ رہی ہے۔

''جب میں تم لوگوں کی عمر میں تھی اُس وقت رمضان کا مہینہ بڑا روح پرور ہوتا تھا۔سحری کے وقت روزہ داروں کو نیند سے بیدار کرنے کے لئے فقیر صدا لگاتے۔''تانبے کا سکہّ جڑی کا رومال اُٹھو مائی بابا سوالی شاہ کا سوال!!''قافلے نکلتے۔''اُٹھو روزے دارو سحر ہو رہی ہے!''افطار کے وقت شاہی نقارے ڈم ڈم بجتے۔دیسی گھی میں چھنی جلیبیاں،باقر خوانی اور دودھ کے ساتھ میدے کی پوری،اخروٹ کا حلوہ اور گلاب جامن سے سحری کی جاتی اور افطار میں عرق گلاب کے ساتھ بادام کا شربت،ماوے کا لڈّو،زعفرانی فالودہ اور عراقی کھجور نہ ہوتی تو بس سب کے چہرے لٹک جاتے۔جس دن تیس روزے پورے ہوجاتے سوالی شاہ کا دامن اشرفیوں سے بھر جاتا۔اب تو یہ سب کے سب قصۂ پارینہ ہوگئے،جیسے ایسا کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔!بیٹی گھبراؤ مت یہ برکتوں والا مہینہ ہے۔اللہ کوئی نہ کوئی سبیل پیدا کر ہی دے گا۔!''اتنا کہہ کر وہ قرآن کریم کی تلاوت میں محو ہوگئیں۔

مغرب کی اذان ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے۔فضیلت النساء اور اس کی دو دو اولادیں دن بھر روزہ رکھ کر ابھی تک منتظر ہیں کہ اللہ کوئی نہ کوئی سبیل پیدا کر دے گا!گھر میں تیل تک نہیں ہے کہ مغرب کے وقت گھر میں چراغ جل سکے۔اُدھر دیوان صاحب کے مکان پر دعوتِ افطار کی تیاری بڑے زور وشور سے اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوگئی ہے۔انواع واقسام کے خوش ذائقہ پکوان سفید سفید طشتریوں میں رکھ دیے گئے ہیں۔گلاس میں روح افزا اور بادام کے شربت قرینے سے سجا دیے گئے ہیں کہ اتنے میں مسجد کے میناروں سے فضا گونج اُٹھی۔

اللہ اکبر.....اللہ اکبر.....!!

اللہ کے نیک بندوں نے افطار سے فارغ ہوکر تین رکعت نماز کے لیے صف بندی کردی۔سربسجود ہوئے۔اپنے رب کی کبریائی بیان کی اور شکریہ ادا کیا۔واپسی پر دیوان صاحب نے تمام مدعوئین کو ایک ایک عطردان اور خوشبو کے پھاہے سے رخصت کیا۔رخصتی کے وقت گزرگاہ ایسے معطر ہوا تھی جیسے اللہ کے فرشتے گزر رہے ہوں۔دیکھتے ہی دیکھتے گزرگاہ خالی ہوگئی۔پھر حکم صادر ہوا کہ جھوٹی طشتریوں کو سامنے میونسپل کے کوڑے دان میں پھینک دیا جائے۔کارندوں نے حکم کی تعمیل کی۔اتنے میں فضیلت النساء کی نوسالہ بیٹی حمیرا کی نگاہ اُس پر پڑی۔وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور زنگ آلود تام چینی کی مرادآبادی طشتری لے کر کوڑے دان کی طرف دوڑتے ہوئے آواز لگائی۔!!

''امّی جان رمضان برکتوں والا مہینہ ہے۔پروردِگار نے سبیل پیدا کردی۔!!!''

○○